ڈاکٹر تبسم کاشمیری کی شاعری کا تنقیدی مطالعہ

Critical Study of Dr. Tabassum Kashmiri's Poetry

DOI: https://doi.org/**10.54692/**nooretahqeeq.**2024.08022201**

ڈاکٹر طاہرہ صدیقہ

Dr. Tahira Siddiqa
Assistant Professor, Department of Urdu
Kinnaird College for Women University, Lahore.

ڈاکٹر کامران عباس کاظمی

Dr. Kamran Abbas Kazmi
Head of Urdu Department
Islamic International University, Islamabad.

Abstract:

Dr. Tabassum Kashmiri's name is very important with respect to modern Urdu poetry because he has significantly participated in the creation of modern poetry and the development of modern poetic style. He is not only a poet, but also a known literary personality of the current era as an excellent teacher, a literary historian, a researcher and a critic. The first landmark of Dr. Tabassum Kashmiri's literary journey is his poetry. He insisted for his identity in the modern poetry and played his role for the provision of this new intellectual context. In this research article, the aesthetic elements have been analyzed which are presented in his poetry.

Keywords:

Urdu Poetry, modern poetic style, Aesthetic, significantly participated, Modern Poetry.

ڈاکٹر تبسم کاشمیری (پیدائش جنوری ۱۹۴۰ء) اردو ادب کے ممتاز نقاد محقق اور شاعر ہیں۔ جدید اردو شاعری کی

روایت میں تبسم کاشمیری ایک معتبر نام ہیں جنھوں نے شعری اظہار کو نئے اسلوب سے آشنا کیا۔ تبسم کاشمیری کی تخلیق زندگی کا آغاز ۱۹۵۸ء میں ہوا لیکن ان کا پہلا شعری مجموعہ "تمثال" ۱۹۷۵ء میں شائع ہوا اور دوسرا شعری مجموعہ "نوحے تخت لہور کے" کے نام سے ۱۹۸۵ء میں شائع ہوا۔ اس کے بعد ان کے تین اور شعری مجموعے "پرندے، پھول، تالاب"، "بازگشتوں کے پل پر"، "کاسنی بارش میں دھوپ" شائع ہوئے۔ ان کی شاعری محسوسات، جمالیات اور رومان سے بھرپور ہے۔ ان کی شاعری ذات کے کرب، زندگی کی اُلجھنوں، فرد کے مسائل اور احساسِ زیست کے موضوعات پر مشتمل ہے۔ انیس ناگی ان کے پہلے شعری مجموعے "تمثال" کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

> "نئی اُردو شاعری کی رو میں تبسّم کاشمیری کی نظموں کا اولین مجموعہ تمثال ایک منفرد خصوصیت کا حامل ہے، گو ادبی تاریخ کے حوالے سے اس مجموعے کو کافی عرصہ پہلے شائع ہونا چاہیے تھا کیوں کہ اس میں جن تجربات اور ان سے پیدا ہونے والے استفسارات کا بیان ہے وہ نئی اُردو شاعری کے خصوصی دور سے منسلک رہے ہیں، تاہم ان نظموں میں ان تمام اجتماعی اور انفرادی واردات و واقعات کی سرگزشت درج ہے جن سے گزشتہ پندرہ بیس سال کے دوران یہاں کا تخلیقی شعور گزرا ہے۔ تبسّم کاشمیری کے شعری مجموعے کا عنوان تمثال معنوی اور صوری اعتبار سے اس کے طریق ادراک اور نظموں کے افہام کا اسلوب متعین کرتا ہے، شاعر نے اپنے عہد کی بے شمار تمثالوں کی شکست و ریخت کے عمل میں اپنی ذات سے پیدا ہوتی ہوئی آگاہی کی تمثال مرتب کی ہے۔"(۱)

ڈاکٹر تبسّم کاشمیری کو اپنی تخلیقی زندگی بے حد عزیز ہے کیوں کہ ذاتی زندگی کے تمام المیوں کو اپنی تخلیقات میں سمو کر انھوں نے اپنی ذات کا کیتھارسس اور اپنی ذات کا اظہار بھی کیا ہے۔ اپنی ذات سے آگہی اور گردوپیش کے حالات و واقعات کا ادراک ڈاکٹر تبسّم کاشمیری کی نظموں میں شعوری کوشش کے طور پر نمایاں ہوتا ہے۔ ان کے نزدیک سب سے بڑی حقیقت ان کی اپنی ذات ہے اور وہ اس کی شناخت پر زور دیتے ہیں۔ وہ اپنی ذات کے واسطے سے مظاہرِ کائنات کا مشاہدہ کرتے نظر آتے ہیں:

ہوا آنکھوں کو چبھتی ہے تو یہ محسوس ہوتا ہے
فقط میں ہوں
مجھے ہونے کا اک احساس ہوتا ہے
مرے ہونے کے اس احساس کی لرزش بند میں سرسراتی ہے
ہزاروں خوشبوئیں یلغار کرتی ہیں

اگر جو سرد موسم ہو کبھی میں کپکپاتا ہوں
کبھی میں راستے میں سوچتا ہوں
تو مجھے احساس ہوتا ہے
کہ میں ہر گز نہیں ہوں (فقط ہونے نہ ہونے سے)(۲)

اس نظم میں تبسّم کاشمیری ہونے نہ ہونے کو دُکھ سے تعبیر کرتے ہیں ایسے عہد میں ہونا بھی تو صدمات اُٹھانے کے مترادف ہے جہاں غربت، ذلّت، جبر اور نفرت ہے لہٰذا اس سے تو نہ ہونا ہی بہتر ہے۔وہ قبل از وجود اخلاق ضابطوں کو قبول کرنے کے بجائے اپنے گردوپیش کی زندگی اور مروّجہ نظام کا گہرا مشاہدہ کرتے ہوئے انسان پر ظلم، معاشرتی ناہمواری اور انسانی منافقت کو انسان کا سب سے بڑا دشمن سمجھتے ہیں اور احتجاج کی صورت اپنے ردعمل کو منظم کرتے ہیں۔ تبسّم کاشمیری نہ صرف معاشرتی ناانصافی پر بلکہ اپنی ذات اور اپنے عوامل پر بھی کڑی تنقید کرتے ہیں مگر چونکہ وہ معاشرتی ناہمواری و ناانصافی کے ماحول میں رہنے پر مجبور ہیں اس احساس کے نتیجے میں ان کے یہاں احساسِ جرم کی کیفیت بھی نظر آتی ہے۔ان کی بیشتر نظمیں اسی احساس کی پیداوار ہیں:

یہ کیسا زہر ہے جو پھیلتا جاتا ہے معدے میں
یہ کاری زہر ہے جو رات کے معدے سے ٹپکا ہے
تشدّد، خوف، دہشت، بربریت
رات کے کالے ستم گر، سیاہ ماتھے پر
ندامت ہی ندامت ہے (ندامت ہی ندامت)(۳)

ایک اور نظم میں بھی اسی قسم کے احساسات ملتے ہیں:

کسیلی بدوضع بدذائقہ راتیں
کسیلے گرم دن جن میں
سبھی شکلیں بدلتی ہیں
کثافت اور ندامت کے
سبھی چہروں پر حملے ہیں
یہ بوجھل بے حیا چہرے
کسی شہوت زدہ تاریک شب کا عکس ہیں گویا
تم ان چہروں میں اپنے آپ کو پہچاننا چاہو

تو پہچانو بھلا کیوں کر
کسے ہمت ہے چہرہ دیکھ لے اپنا
کلیجہ منہ کو آئے گا
کسیلی بد وضع بد ذائقہ راتیں
یہ بوجھل بے حیا چہرے (یہ بوجھل بے حیا چہرے)(۴)

ایک اور جگہ کہتے ہیں:

ہم اونچی چمنیوں میں شور کرتے کارخانوں میں
دھوئیں سے پیٹ بھرتے ہیں
ہمارے نامۂ اعمال میں ہر گز نہیں بخشش
فرشتے ہم سے نالاں ہیں
ہمارے سُرخ ماتھوں پر گناہوں کی لکیریں ہیں
تشکک کی لکیروں نے ہمارے راستے روکے
سبھی راہیں تشکک کی نئی بیلوں میں اُلجھی ہیں
نئے معنی کو پانے میں
زمیں پہ پیچ رستوں، ہول راہوں
رات کے اندھے جزیروں سے گزرتے ہیں
کوئی رستہ نہیں ملتا (اگر موسم بدل جائے)(۵)

اس احساسِ جرم کے جملہ محرکات اسی معاشرے کی غاصبانہ فعلیت میں مضمر ہیں جس میں انسان کی شناخت کی گمشدگی، بے ہئیتی، منفی قوتوں کی بالادستی، عقیدے کی مابعد الطبیعات سے انکار نے انسان میں مایوسی کی وجودی صورتحال کو پیدا کر رکھا ہے۔ زوال کے اس عہد میں تبسّم کاشمیری اس بدہئیت عہد کے کرب کو شعری تمثال میں منتقل کرتے ہیں جہاں سفاک تاریکی، ہونے نہ ہونے کے مابین ایک لمحے کی غیر یقینی مہلت، صدیوں کے رائیگاں خواب، بے معنویت، لاحاصلی کا سرطان تمام شہر، تمام عہد کی پسلیوں میں پھیلتا جا رہا ہے۔ مجموعی طور پر تبسّم کاشمیری کی شاعری میں جدید دور کی تمثال ایک مغلوب اور گہری افسردگی کے شکار انسان کی صورت ظاہر ہوتی ہے جو کہ تبسّم کاشمیری اور اس عہد کے ہر حساس انسان کی سوانح عمری ہے۔

ڈاکٹر صدف بخاری اس ضمن میں اپنے مضمون ''ڈاکٹر تبسم کاشمیری کی منتخب نظمیں۔ ایک تنقیدی جائزہ'' میں

رقم طراز ہیں:

”موضوعاتی اعتبار سے ان نظموں کی فضا ایک مکمل شہر آشوب کی سعی ہے جس میں ہر آن ظلم سہتی مخلوق انفرادی اور اجتماعی سطح پر جینے کی سعی لاحاصل میں مصروف ہے قدم قدم پر عفریتوں کی گھاتیں ہیں اور انسان اپنے انسان ہونے کے وصف سے محروم ہوتا نظر آتا ہے۔ یہ انسان ظلم سہنے والا بھی ہے اور ظلم کرنے والا بھی۔ تبسم کاشمیری کی نظم کا ایک رنگ انفعالی بھی ہے لیکن یہ تخیلاتی سطح کی رومانوی انفعالیت نہیں بلکہ اپنے ماحول سے برسرِ پیکار ایک ایسے شخص کو سامنے لاتی ہے جو اپنے گردوپیش پھیلی وسعتوں میں تنہا رہ گیا ہے۔۔۔اس عہد کی خاصیت یہ ہے کہ واقعی یہ عہد برق رفتاری، بربریت، آمریت، عالمگیریت اور اس سارے ہجوم سے باہر نکل کر آنے کی کوشش کرتی ہوئی فرد کی انفرادیت کا عہد ہے۔“(۶)

ڈاکٹر تبسّم کاشمیری کی شاعری میں اپنی ذات سے آگاہی اور گردوپیش کا شعور ایک شعوری کوشش کے طور پر نمایاں ہوتا ہے۔ وہ انسانی عوامل میں ہر حقیقت کو اپنی ذات کے حوالے سے دیکھتے ہیں۔ تبسم کاشمیری کی شاعری میں نہ ہونے کا احساس دراصل آگہی کی ایک منزل ہے جہاں رائیگانی اور لاحاصلی کا احساس دامن گیر ہوتا ہے اور ساتھ ہی لاحاصلی یہ احساس بھی دلاتی ہے کہ ہر نسل لاحاصلی کے کرب میں مبتلا ہے۔ ہمارے آباواجداد بھی یہ سوچتے تھے کہ اُن کے ہونے سے اُنھیں کیا حاصل ہوا اور اب شاعر بھی اپنی شاعری کے ذریعے اپنی ذات اور اپنے عہدِ زوال کی لاحاصلی پر افسردگی کا شکار ہیں کہ مفلسی، ذلتوں اور نفرتوں کے صدمے جھیلنے سے تو کہیں بہتر ہوتا کہ ہم نہ ہوتے۔ اپنی نظم ”کب سے اپنی تلاش“ میں کہتے ہیں:

میں کب سے اپنی تلاش میں ہوں
میں کب سے خود کو تلاش کرتا زمیں کے تلووں کو چاٹ آیا
زمیں کی پوشیدہ مسطحوں پہ میں جھانک آیا
میں تار لمحوں کے ساحلوں کی ترائیوں میں لڑھک لڑھک کر
میں دلدلوں کی اتھاہ پکڑ میں جکڑا گیا ہوں
میں حیرتوں کے مہیب جنگل میں گُم ہُوا ہوں
میں سبز کائی میں کھو گیا ہوں
میں آپ اپنی تلاش کرتا

زمیں کے چہرے پہ ریزہ ریزہ بکھر گیا ہوں

اسی نظم کے آخری حصے میں نئے سوال زمین کے سینے سے اُگتے محسوس ہوتے ہیں:

میں پوچھتا ہوں
میں کیا ہوں کیوں کر ہوں کس لیے ہوں؟
زمیں کی پوشیدہ مسطحوں پہ خموشیاں آج تیرتی ہیں
اور حیرتوں کے سفید ساحل پہ خامشی آج اُگ رہی ہے
نئے زمانے کی تازہ تولید
تازہ موسم کی گزر گاہوں میں ہو رہی ہے
میں کب سے اپنی تلاش میں ہوں
میں آگہی کی عظیم یورش سے پھٹ رہا ہوں
زمیں کے چہرے پہ ریزہ ریزہ بکھر رہا ہوں (۷)

تبسم کاشمیری کی شاعری سے المیاتی تاثر ابھرتا ہے کہ وہ معاشرے کی شکست وریخت اور انسان کے عہدِ زوال کے دور میں زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔ سائنسی اور ٹیکنالوجی کی ترقی کے اس دور میں آلات انسان کے احساسِ مروت کو کُچل چکے ہیں اور وہ بھری دنیا میں خود کو تنہا اور مجبورِ محض سمجھتا ہے۔ ایسے میں ان کی شاعری معاشرتی مسائل کے انبوہ، بے ہئیت زیست اور انسان کی بے جہت مسافرت کی داستان سناتی محسوس ہوتی ہے۔ اپنی ایک خوبصورت نظم ''غضب وہ شب تھی۔۔۔'' میں بھی صدیوں سے اُداس نسلوں کے غم و الم کی داستان بیان کرتے ہوئے شاعر آنسوؤں بھری آنکھوں سے یہ سوال کرتا دکھائی دیتا ہے کہ آخر یہ شبِ غضب کتنی دراز ہے۔ آخر انسان کب رنج والم سے نجات پا سکے گا۔ وہ جو اپنے نحیف شکموں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اہلِ منبر کا درس بن کر یہ گیت گاتے ہیں کہ خدائے بزرگ وبرتر تیرا شکر ہے کیا روز اُن کی شہادت اُن کا مقدر ہے جس سے اُنھیں کبھی نجات نہ مل سکے گی۔ طبقاتی شعور کا یہ شدید احساس تبسم کاشمیری کی ترقی پسندانہ فکر کے سبب ہے۔ اُن کی نظم ''سمندر کتنا گہرا ہے؟'' کا ایک حصہ مُلاحظہ کیجیے:

ٹریفک کا یہ پھیلا اِزدحام بے کراں بڑھتا ہی جاتا ہے
دھواں جلتا ہے کاروں کا
تو پھر سُوئے فلک پرواز کرتا ہے
مگر پھر بھی جلن سے میرے نتھنے پھڑ پھڑاتے ہیں
یہ آگے پیچھے چلتے لوگ۔ اِک لٹّو کی صورت میں

جہاں سے صُبح چلتے ہیں وہیں پہ شام آتے ہیں
مگر منزل کسے معلوم؟
کوئی اتنا بھی نہ جانے سمندر کتنا گہرا ہے
کہ ہم بجرے کی صورت میں سطح پر پھرتے رہتے ہیں
غضب گہرائی ہے اس کی
ہوا دھیرے سے جانے کون سی منزل کو چلتی ہے
مگر منزل کہاں ہے اور نشاں معلوم ہے کس کو(۸)

وہ ایک نئی، اُجلی اور روشن صُبح کا خواب دیکھتے ہیں اور پھر "اگر موسم بدل جائے" میں نئے موسم کی آمد کی بشارت دیتے ہیں کہ ہمارے سُرخ ہاتھوں سے گناہوں کی لکیریں مٹنے والی ہیں:

سلاخیں ٹھنڈی ہوں گی اور فرشتے دم بخود ہو کر
ہمیں حیرت سے دیکھیں گے
اگر موسم بدل جائے، شگوفے سُرخ ہو جائیں
ہمیں آواز دے لینا
کہ ہم دیکھے ہوئے منظر کو دیکھیں گے(۹)

دراصل شناخت کی گمشدگی، بے شکل زندگی میں کسی سہارے کے بغیر زندہ رہنے کے جبر، معاشرے میں منفی طاقتوں کی برتری، مابعد الطبیعات سے انکار اور مایوسی کی وجودی صورتحال ان کی شاعری کا مرکزی نقطہ ہے اور اس کے نتیجے میں وہ تنہائی، بے گانگی، عدم تحفظ اور جنسی محرومی کا شکار رہے ہیں۔ وہ زندگی کو باحوصلہ انداز سے بسر کرنے کے آرزو مند ہیں مگر زندگی کا جبر اُنھیں افسردہ رکھتا ہے۔ مجموعی طور پر اُن کی شاعری میں دورِ حاضر کی تمثال ایک مایوس، آزردہ خاطر اور مغلوب انسان کی صورت میں نمایاں ہوتی دکھائی دیتی ہے، جو اس عہد کے ہر حساس انسان کی زندگی کی داستان بھی قرار پاتی ہے۔ سرمد صہبائی لکھتے ہیں:

> "اس مجموعے کی اکثر نظمیں ۶۵ء کی جدید شاعری کی تحریک کے پس منظر میں لکھی گئی ہیں لیکن مجموعی طور پر تبسّم کاشمیری اپنے باقی تجریدیت پسند ساتھیوں کی طرح تجریدیت کا cult نہیں بناتا بلکہ "شبِ غضب" کے اس تاریک سفر میں آگہی کی روشنی بھی پھوٹتی ہے۔ تشکیک، استفہام اور انکار! تبسّم کاشمیری کی منزل اسی "آگہی" کی دریافت ہے کہ کرب اور لاحاصلی کا یہ سفر طبقاتی شعور کی طرف ہے۔"(۱۰)

تبسم کاشمیری نے اپنی شاعری میں علامتی نظام کو آگے بڑھایا ہے۔اُنھیں اپنے ارد گرد کے شہروں اور قصبوں سے بے حد محبت ہے۔اُن کی شاعری میں تمثال کے نہایت دلکش اور عمدہ و نادر نمونے ملتے ہیں۔ تبسم کاشمیری نے اُردو شاعری میں تمثال نگاری کی طویل روایت میں اپنی انفرادیت برقرار رکھی ہے۔وہ نے اپنے اوّلین شعری مجموعہ تمثال میں سماجی و معاشرتی ناانصافی، بے حسی اور عدم مساوات پر احتجاج کرتے ہوئے شہروں کی تباہ حالی اور بربادی پر کڑھتے ہیں۔ اُنھوں نے اس شعری مجموعے میں لرزہ خیز تمثالوں اور علامتوں کا جابجا سہارا لیا ہے:

میں ساری رات ان اشیا کے نوحے سنتا رہتا ہوں
اندھیرے کے سیاہ تودے مکانوں پر برستے ہیں
چٹانیں سیاہ بادل کی جو شہروں پر لڑھکتی ہیں
تو ہر شے چیخ اُٹھتی ہے
غضب بدہئیت بادل ہے جو ان شہروں پر چھایا ہوا ہے (۱۱)

تبسم کاشمیری کی شعری تمثالیں اس لیے بھی پُرکشش معلوم ہوتی ہیں کہ وہ شاعری میں ابلاغ کے بجائے اظہار کے قائل ہیں۔ مگر اس کے باوجود ان کی نظمیں قارئین پر اپنا خاص تاثر چھوڑتی ہیں۔ان کی نظمیں اُداسی اور غم کے جذبات سے لبریز ہیں۔یہ زوال کے نوحے معلوم ہوتی ہیں کہ اُن کے نزدیک خزاں کا موسم جانے کا نام ہی نہیں لے رہا، حبس اور گھٹن کا احساس ہے اور اس سے شاعر مایوسی اور دل گرفتگی کا شکار ہے۔ان کی نظموں میں انسانی بے بسی کا نوحہ دردو کرب کی مختلف لہریں اور غم واندوہ کے بہت سے رنگ اُن کی نظموں میں موجود ہیں۔ تمثال میں شامل ایک نظم "میں وہیل کے پیٹ میں تھا" علامتی انداز کی نظم ہے، جس میں ایک دفتری اہلکار اپنے ساتھی اہلکار کو اپنا غم سناتا ہے اور پھر آگے چل کر بوس اور نوری کے کردار اس نظم میں شامل ہو جاتے ہیں:

"ہاں بوس نوری بہت خوبصورت ہے
دوسرے شو پہ کل وہ میرے ساتھ تھی"
"ترے ساتھ تھی؟"
بہت ہی عجیب ہے
تیسرے شو پہ آکر مجھے مل گئی تھی"
"اور پھر رات کو وہ کہاں تھی؟"
"نہیں جانتا میں" (۱۲)

اس نظم میں بے وفا نوری کا کردار وہ مشترک دُکھ ہے، جس سے پورا معاشرہ دوچار ہے۔پہلے شو میں وہ کسی اور

کے ساتھ تھی دوسرا اور تیسرا شو اُس نے دیگر دفتری اہلکاروں کے ساتھ گزارا پھر شب بسری کا اہتمام کسی اور کے نام تھا۔ اسی طرح نظم "زوال کی آخری چیخ" میں چیخ کو تبسم کاشمیری نے علامت کے طور پر استعمال کیا ہے:

سیاہ چیخ کا سُرخ جنگل اُگا تھا
کوئی چیخ اب بھی اُبھرتی تھی جس سے
گنبد کے دیوار و در کانپتے تھے
کوئی شے دکھائی نہیں دے رہی تھی
فقط اِک دھواں تھا
جو گنبد کے سوراخ سے اپنے پاؤں نکالے
ہواؤں کے بے داغ سینوں سے چمٹا ہوا تھا (۱۳)

تبسم کاشمیری نے اپنی نظموں "زوال کا بادل"، "ہزار پایہ"، "شہر خواب"، "شہر کالے عذاب میں ہے" اور "زوال کی آخری چیخ" میں مختلف تمثالوں اور علامتوں کی مدد سے اسی موضوع کو بیان کیا ہے۔ ان نظموں میں اُنھوں نے لوگوں کی دردناک چیخوں کو مختلف علامتوں کے ذریعے پیش کیا ہے۔ اُن کی نظم "زوال کا بادل" ایسی نظم ہے جو اپنے گردو پیش چھائی ہوئی بد ہئیتی اور بے سمتی کا نوحہ ہے لہٰذا بادل کی علامت یہاں بارش لے کر آنے والے مہربان پیامبر کے برعکس خوف اور ہیبت طاری کرنے والے ستم گر کی بنتی دکھائی دیتی ہے۔ اس کے زیر اثر تمام ماحول اپنی شناخت کھو بیٹھا ہے۔ یہ بادل ساری فضا کو ایک عجیب سے ابہام میں مبتلا کیے ہوئے ہیں، جس سے نہ وقت کے تعین کا احساس ہوتا ہے اور نہ ہی اس صورتحال سے باہر نکلنے کی کوئی صورت نظر آتی ہے۔

نظم "ہزار پایہ" کا عنوان ایک ایسی علامت کی تشکیل کرتا ہے جو اپنے پنجے ہر طرف گاڑے ہوئے ہے۔ ایک جگہ پر ہوتے ہوئے بھی ہر سمت اپنی موجودگی کا احساس پیدا کرنا اس عہد کے اس ظالم اور اندرون سے خوف زدہ انسان کی تصویر اُبھارتا ہے جو محض ظلم و بربریت کے ذریعے دوسروں کو خوف زدہ رکھ کر خود کو طاقتور بنانا چاہتا ہے۔ اس نظم میں دراصل انسان کی ہوسِ اقتدار اور مطلق العنانی کا مسئلہ بیان کیا گیا ہے۔

اس انداز کی نظموں کے ساتھ ساتھ اس شعری مجموعہ میں ایسی نظمیں بھی موجود ہیں، جن میں شاعر اپنے اطراف پھیلی ہوئی بدصورتیوں کے باوجود رومانوی سطح پر زندہ رہنے کی کوشش کرتا دکھائی دیتا ہے۔ ان نظموں میں تمام تر جبر کے باوجود زندہ رہ جانا صرف غنیمت ہی نہیں لگتا بلکہ ظلم و تشدّد کے خلاف ایک درویشانہ مزاحمت بن جاتا ہے۔ اس سلسلے کی چند اہم نظموں میں "اگر موسم بدل جائے"، "آنکھ کا جادو"، "انکار کی سرحد پر"، "پھول کھلے ہیں چیری کے" اور "نیلے پانی کشتیاں" خاص طور پر قابلِ غور ہیں۔

تبسّم کاشمیری نے تمثال میں جو لسانی انداز اختیار کیا ہے وہ کسی حد تک تجرباتی بھی ہے اور روایتی بھی۔ یہ دوہری کیفیت ان کے ذہنی تذبذب کا نتیجہ ہے۔ کبھی وہ نئے لسانی نظام کو وضع کرنے کے لیے نئے انداز اپنانے کے بجائے مروّجہ لسانی ترکیبات کو استعمال کرتے ہیں اور ایک ہی نظم میں الفاظ کی رسمی وغیر رسمی بندش معانی کے اسلوب کو کسی قدر اُلجھا دیتی ہے۔ اس تذبذب کے باوجود وہ تفہیم کے لیے زبان سے جدوجہد کرتے دکھائی دیتے ہیں اور الفاظ کی ناتراشیدہ حالت سے بھی معنی آفرینی کرتے ہیں۔

تمثال کی اشاعت کے بعد تبسم کاشمیری کی ایک طویل نظم نوحے تخت لاہور کے طبع ہوئی جو کہ اُردو شاعری میں تازہ ہوا کا جھونکا ثابت ہوئی۔ یہ تبسم کاشمیری کی نظموں کا دوسرا مجموعہ ہے، جس میں اُنھوں نے لاہور شہر کے ماضی کو اچھی طرح کھنگالتے ہوئے روحانی اور تاریخی کہانیاں بیان کی ہیں۔ لاہور کے سیاسی و سماجی حالات کے ساتھ منسلک پریشان کُن توقعات کو الفاظ کی شکل میں ڈھال کر پیش کیا۔ اُنھوں نے ماضی کی کہانیوں کو حال کے آئینے میں دیکھنے کی نہایت کامیاب کوشش کی ہے۔ نوحے تخت لاہور کے میں ان کی نظمیں الگ الگ ہونے کے باوجود بغیر عنوانات کے یوں تحریر کی گئی ہیں کہ سارا مجموعہ ایک ہی طویل نظم محسوس ہوتا ہے حالانکہ ہر نظم اپنی جگہ ایک مکمل تاثر کی حامل ہے اور ایک مکمل نوحے کی شکل میں ہے۔

انھوں نے شہر لاہور کی ویرانی کی نوحہ گری کرتے ہوئے جبر اور خوف کو شاعری کا بنیادی تجربہ بنایا ہے۔ دراصل یہ نوحے تیسری دنیا کے تمام شہروں کے مقدّر کی آواز ہیں۔ تبسّم کاشمیری نے ان نوحوں کو جسم کی علامت کے ذریعے بیان کیا ہے۔ شہر کی علامت کی یہ تدریجی قلبیت نظم کے معنی میں کئی ایک سطحیں پیدا کرتی ہے۔ نوحے تخت لاہور کے ایک ہی تجربے پر مشتمل ہے جن کی جذباتی رنگت متغیر ہوتی رہتی ہے۔ اکتالیس صفحات پر مشتمل یہ نظم اپنے امیجز، اسلوب اور ڈکشن کے اعتبار سے شاندار اور گہری معنویت و بھرپور تاثر پر مبنی نظم ہے۔

طویل نظم ''نوحے تخت لاہور کے'' کا بنیادی محور شہر لاہور ہے اور تبسم کاشمیری اس شہر کی ویرانی کے نوحہ گر ہیں، جس کی ویرانی کا سبب جبر و خوف ہے۔ اس شہر کی شریانوں میں خون کے بجائے زہر اور آگ بھری ہے، اس شہر کے چہرے پر کوئی خواب کا پھول دکھائی نہیں دیتا سب خواب پگھل کر بکھر چکے ہیں اور سُرخ الاؤ کے اندر سب خواب جل کر راکھ ہو چکے ہیں:

شہر کے رنگ جو سبز تھے پہلے
اب جل کر سب زرد ہُوئے ہیں
شہر کے رنگ جو سُرخ تھے پہلے
اب وہ پیلے زرد ہُوئے ہیں

شہر کا چہرہ زرد ہُوا ہے
شہر کی آنکھیں زرد ہُوئی ہیں
شہر کا جسم اب زرد ہُوا ہے
شہر کا شہر اب زرد ہُوا ہے (۱۴)

اس طویل نظم "نوحے تخت لاہور کے" میں خواہشات کے المناک حادثے نظر آتے ہیں اس کے ساتھ ساتھ جاگیر دارانہ و سرمایہ دارانہ نظام پر طنز کاری کی گئی ہے۔ اس طویل نظم کی تخلیق کا پس منظر دراصل ۱۹۷۷ء میں نافذ کیے جانے والا مارشل لا ہے۔ اس مقصد کی خاطر تبسم کاشمیری نے طویل نظم کے کینوس کو پہلی بار استعمال کیا ہے۔ یہ نظم لسانی تشکیلات کی تحریک اور لسانیاتی ڈکشن میں تبدیلی کی نمائندہ نظم ہے۔ اس نظم میں جلتے ہوئے جسموں کو سرخ انار قرار دیتے ہوئے جلنے کی آوازوں کو مختلف سمعی بصارت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے جیسے تڑاخ تڑاخ، ساں ساں، شاں شاں، پھٹے اور پگھلتے انسانی بھیجے پھڑ پھڑ پھڑاخ، پھڑ پھڑ پھڑاخ اور جلتے بال اور جلتی کھالوں کے لیے تڑ تڑ، ٹر ٹر، تڑ تڑ اور جسم کی چربی چر چر، چر چر پگھل پگھل کر ٹپ ٹپ ٹپ ٹپ شہر کی ساری گلیوں میں پھیلتی دکھائی گئی ہے۔ اس شہر کا سارا جسم صدیوں کی اس کالی دُھوپ سے گھائل دکھایا گیا ہے، اس شہر کی دیواریں اور روشندان بھی شکستہ اور گھائل آنکھیں خول سے باہر آچکی ہیں اور خول کے اندر واپس جانے کے لیے آنکھ میں طاقت ہی باقی نہیں رہی:

"شہر کا جسم اب
موت کا منظر
دیکھ رہا ہے
کب سے نرخرہ
خرڑ خرڑ خر
بول رہا ہے
نرخرہ کب سے
خرڑ خرڑ خر
بول رہا ہے
موت کی شکل کو
دیکھ رہا ہے
ہانپ رہا ہے (۱۵)

تبسم کاشمیری نے اس نظم میں صورت حال کی گھمبیر تا کو دردناکی سے تفصیلاً بیان کرتے ہوئے اُردو زبان میں پنجابی شعری ڈکشن شامل کر کے ایک اور لسانیاتی تجربہ نہایت خوبی سے کیا ہے۔ جیسے بابا فرید کو مخاطب کر کے کہتے ہیں:

وٹھڑی پالی سدا متوالی
ساون آیا روہی ڈٹھڑی
بار تھئی گُلزار
تھیاں سر سبز فرید دیاں جھوکاں
ہجوں خنکی چائی سوکاں
نند نمانوں کھیر
مولیٰ ماڑ وسایا"
یار فریدا!
روہی سُوکھی (۱۶)

نظم میں تبسم کاشمیری نے شہر کے جسم پر پھیلی ہوئی آہن اور سیسے جیسی دُھند کو ایک شکاری کُتا بن کر شہر کے جسم کو چیرتا ہوا دکھایا ہے جس کے نتیجے میں "ایہہ تن شہر دا پُرزے پُرزے جیوں درزی دیاں لیراں"۔ لہٰذا وہ اپنی اس نظم میں لسانیاتی ڈکشن کے بھی تجربے کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

دراصل "نوحے تخت لاہور کے" میں بیسویں صدی کے لائے ہوئے عذابوں، مارشل لا کی جکڑبندیوں، سرمایہ دارانہ نظام کی بربادیوں کے سلسلے کو لامتناہی قرار دیتے ہوئے ایسا منظر نامہ پیش کیا ہے کہ سب سمتیں بے سمت ہو چکی ہیں اور ان اندھی سمتوں پہ کوئی تارا، کوئی بادل، کوئی آس کا پنچھی کچھ بھی نہیں ہے۔ سب اطراف پہ بے خوابی اور خاموشی کا راج ہے۔ یہاں چاند کو نکلے سالہا سال بیت چکے ہیں۔ اب ان سمتوں پہ پھول بھی نہیں ہیں، پیڑ بھی نہیں اور وہ اب ان اندھی سمتوں کے رستے بھی فراموش کر چکے ہیں۔ جس کے نتیجے میں اب یہ تمام رستے ایک بھیانک جنگل کی دلدل میں بڑھتے جا رہے ہیں۔ اب یہ شہر ایک جنگل میں تبدیل ہو چُکا ہے یہاں کوئی بھی شے پُوری نہیں سب چیزیں جیسے دن، شب، چاند، سُورج، بُھوک، خواہش، پیڑ، پتے، پُھول اور پنچھی آدھے آدھے ہیں۔ اس شہر میں سایوں کے انسان دوڑتے پھرتے ہیں دفتر، فائلیں اور فائلوں پر جُھکتے سائے اور کُرسیاں، میزیں، کاؤنٹر، کپڑے اور مشینیں ٹک، ٹک، ٹک، ٹک، کھڑ، کھڑ، کھڑ، کھڑ کڑ، کڑ، کڑ، کڑ گھڑ، گھڑ، گھڑ، گھڑ، گھڑ سب آوازیں، ساری شکلیں دوڑتی دکھائی دیتی ہیں۔ مگر ان سایوں کے انسانوں کو کچھ بھی معلوم نہیں ہے۔

یہ شہر گنبدوں، مقبروں، فنکاروں اور شاعروں والا شہر ہے جس میں طلوع ہونے والی صُبح کیسی ہے کہ اس کے

سر پر سانپوں والا تاج سجا ہوا ہے اور اس کی آنکھ میں جھیلوں جتنے آنسو ہیں۔ تاریخی، سماجی و ثقافتی زرخیزی رکھنے والے شہر لاہور سے اُس کا قیمتی خزانہ چھینا جا رہا ہے۔ اس شہر میں بسنے والی جگنی جو تختِ لہور کی گلیوں میں چانن کیا کرتی تھی اب نجانے کن دیسوں میں ہے، معلوم نہیں۔ یہ شہر اب جگنی کو فراموش کر چکا ہے۔ تبسم کاشمیری انتہائی دل گرفتگی کے ساتھ شاہ حُسین سے کچھ یوں مخاطب ہوتے ہیں:

لڑیاں وٹ وٹ شاہ حُسینا!
اب ہاری یہ جِندڑی
اور چرخڑا روتا جائے
روئی کتن والی
دونوں شاہ حُسینا روئیں
لڑیاں وٹ وٹ روئیں
ہاتھ میں چِیرے
دِل میں چِیرے
سارے جسم پہ چِیرے
کون رکھے چِیروں پر مرہم
ظالم دُنیا والے
گھومتا جائے پھر بھی چرخڑا(۱۷)

تبسم کاشمیری اس نظم میں دُھوئیں سے بھرپُور ایک کنویں میں سارے شہر کو عذاب میں اُلٹا لٹکا دکھاتے ہیں کہ جہاں سارے خواب، آدرش اور سارے جذبے اُلٹے لٹک رہے ہیں۔ اس دُھوئیں کی تلخی سے حلق اور نتھنے کڑوے ہو چکے ہیں اور شاعر خود کو شہر کے پاتال اور عفریتوں کے پیٹ میں گُم اور اپنی ہی تلاش میں گُم محسوس کرتے ہیں:

ان رستوں پہ
خواب ہیں بکھرے
ان رستوں پہ
رنگ ہیں اُدھڑے
ان رستوں پہ سب تمثالیں
ڈھونڈ رہا ہوں

گُم شدہ معنی،
گُم شدہ اسم کو
ڈھونڈ رہا ہوں
اپنے آپ کو ڈُھونڈ رہا ہُوں
اسمِ اعظم ڈُھونڈ رہا ہوں (۱۸)

شکستگی ، اجتماعی مایوسی، آدرشوں کی شکست، تنہائی ، لایعنیت، جبر اور گھٹن اُس دور کی جذباتی صورت حال تھی، جسے تبسم کاشمیری نے ''نوحے تخت لاہور کے'' میں شہر کے کُہنہ پیڑوں، چہروں، شہر کی دیواروں اور بازاروں پر گہری اُداسی کی شکل میں پیش کیا ہے۔ ہر روز دن چڑھتا ہے اور شہر کے اُوپر نیلی چھت پر روشنی پھیلنے لگتی ہے مگر شہر کی چھت کے نیچے سرد زرد اندھیرے کا غلبہ رہتا ہے۔ ایک عفریت ہے جو شہر کی چھت کے اُوپر بیٹھا ہے اور اس شہر پہ گرنے والی روشنیوں کو چاٹ رہا ہے۔ شہر کا جسم جبر کی کالی رات کی دُھوپ تلے قید ہے اور اب تو سانس لینا بھی دُشوار ہو چُکا ہے۔ ہماری اجتماعی خوشحالی کی راہ میں ایک دیوار مثلِ آہن حائل ہے، جس کے سخت حصار سے نجات پانے کے لیے شاعر، شہر کے رستے، گلیاں، پنچھی، پیڑ، کھیت، دہقان ٹکراتے رہتے ہیں۔ نظم کے اگلے حصے میں شہر کے دروازوں کے باہر بازی گروں کی موجودگی کا ذکر کیا گیا ہے جو کہ محمد منشا یاد کے علامتی افسانہ ''تماشا'' کی یاد تازہ کرتا ہے۔ اس افسانے میں پاکستان کی سیاسی زندگی میں آمریت کی طویل دوپہریں سبھی کے تجربے کا حصہ معلوم ہوتی ہیں۔ افسانے کی پوری ساخت اول سے آخر تک علامتی ہے اور تمثیلی عنصر بھی اس علامتیت کا حصہ ہے۔ تبسم کاشمیری کی طویل نظم ''نوحے تخت لاہور کے'' بھی پورا معاشرہ اپنی روحانی، سماجی، سیاسی اور اخلاقی تصورات سے محروم ہوتا دکھائی دیتا ہے۔ اس شہر پر بھی آسیب کا سایہ ہے اور تمام شہر کی فضا میں سیاہ دھواں اور لہو کی بُو کا غلبہ ہے۔

نظم کے اس حصے میں جہاں بازی گروں کا ذکر ہے تماشا جاری ہے۔ بچہ جمہورا عامل کی ہر بات کا جواب دیتا ہے مگر آخر میں عامل کے استفسار پر یہ بتلانے سے قاصر نظر آتا ہے کہ وہ کہاں ہے کیوں کہ اُس کی دونوں آنکھوں پر سانپ کا پہرہ ہے اور اُس کی زبان پر ایک بچھو بیٹھ جانے کی بنا پر بولنا دُشوار ہو جاتا ہے۔ عامل کے بار بار آواز دے کر واپسی کے تقاضے پر بھی بچہ جمہورا واپس نہیں آسکتا۔ نظم کے اس حصے میں چمگادڑوں، سانپ، بھیڑیے، اُلّو اور بچھو کے الفاظ پاکستان کے سیاسی نظام میں جبر اور خوف و دہشت کی علامت بنتے دکھائی دیتے ہیں۔

اُردو کے جدید علامتی افسانے کی آبرو رشید امجد کے افسانوں میں جس طرح افسانوی کردار بے نام اور بے شکل دکھائی دیتے ہیں۔ اس نظم میں بھی افراد و معاشرہ بے سمتی اور اپنی شناخت سے محرومی کا شکار ہیں۔ لیکن تبسم کاشمیری اس بے چہرہ، بدہیت اور زوال پذیر معاشرے میں اپنی شخصیت کا اثبات اور اپنی حیثیت کا تعین چاہتے ہیں۔

نظم میں شاطر طاقت شطرنج بچھائے ایک ایک مُہرے کو گھور رہی ہے اور اُن کے حکم پر چلنے والے بے چارے، بے بس مُہرے کانپتے دکھائی دیتے ہیں۔ شہر کے اندر اور شہر کے باہر شکلوں کا کہرام مچا ہوا دکھائی دیتا ہے، خونی کُتے انسانوں کا گوشت کھاتے اور اُن کا خون پیتے ہیں۔ وحشی بھیڑیے سُرخ شرابیں پی کر انسانی گوشت کے اُوپر، اُن کے خوابوں اور آدرشوں پر ناچتے دکھائی دیتے ہیں۔ شام کے وقت دن بھر کے کھیل کُود کے بعد بچوں کو شہر کے بُوڑھے ہاتھ تھپکتے ہوئے لوریاں سناتے ہیں:

شہر کی میٹھی لوریاں سُن کر
اچھے باوے، پیارے باوے
الھڑ بلھڑ مُنّے باوے
آنکھوں میں کچھ سپنے لے کر
خوابوں کے پتوں کے اُوپر
کنک کے سپنے دیکھتے دیکھتے
میٹھی نیند میں سو جاتے ہیں (۱۹)

تبسم کاشمیری نے اس نظم میں شہر لاہور بلکہ صوبہ پنجاب کی لوک داستانیں، نظمیں اور گیت بھی شامل کیے ہیں جو اس پورے صوبے کی ثقافت اور تہذیب کی عکاسی کرتے ہیں۔ جیسے الھڑ بلھڑ باوے کا، دمادم مست قلندر، الف اللہ چنبھے دی بُوٹی، لعل قلندر سخی شہباز قلندر، سسی، پُنوں کا قصہ، ''صاحبا تیری بندی ہُوں میں چنگی ہُوں یا مندی ہُوں میں''، ''یار سجن اب رُل گئی جندڑی'' وغیرہ۔ وہ اس شہر کو تھل قرار دیتے ہیں جہاں سسی پُنوں کے پیچھے صدیوں سے دوڑ رہی ہے۔ مرزا خُون میں لت پت ہے اور اُس کی صاحباں اُس کے قدموں میں دم توڑ رہی ہے۔ اس شہر میں رانجھے کی ونجھلی ٹوٹ گئی ہے اُس کی ہیر زنجیروں میں جکڑی ہوئی ڈولی میں اکیلی چیختے ہوئے اپنے رانجھن کو آوازیں دے رہی ہے۔ شہر کے سب سے اُونچے میناروں پر جلتی دُھوپ میں اس شہر کا شاعر بُلھے شاہ ''چھیتی بوڑھیں وے طبیبا نئیں تے میں مر گئیاں'' کہتا چیخ رہا ہے۔ وہ جو عشق کی آگ میں جل کر ''تیرے عشق نچایا کر تھیّا تھیّا'' گایا کرتا تھا شاعر اُسے کہتے ہیں کہ اب سارا شہر تھیّا تھیّا ہے سارا شہر طبیبوں سے خالی اور شہر کا شہر مریض ہوا ہے۔ سخت وبا پھیلی ہوئی ہے اور جرثومے ہر سُو پھیل رہے ہیں۔ گلیوں، بازاروں اور گنبد میں بلھے شاہ اب تک چیخ رہا ہے۔

تبسم کاشمیری ان تمام عذابوں سے نجات کے لیے درد بھرے انداز میں شاہ حُسین اور بلھے شاہ کو آواز دیتے ہیں۔ تبسم کاشمیری کے نزدیک عصرِ حاضر کے انسان کو اپنے تمام دُکھوں اور غموں سے چھٹکارا پانے کے لیے اپنے اندرون سے منسلک ہونے اور روحانیت کا سہارا لینے کی اشد ضرورت ہے۔ بلھے شاہ یہ کہتا ہے:

''لفظوں کی سرحد سے نکلو
سارے لفظ ہیں ایک اشارہ
سارے لفظ ہیں اسم، علامت،
یا پھر ہیں تمثالیں
لفظوں کی یہ بُھول بُھلّیاں
معنی اور بے معنی کے یہ
سب کے سب بے معنی چکر
سب کی سب بے معنی باتیں
بُلّھے شاہ کی بات کو سمجھو
بُلّھے شاہ یہ کہتا ہے:
''رکھ صاف اندر دی کوٹھی''(۲۰)

تبسم کاشمیری لوک داستان "ہیر رانجھا" کی مدد سے اپنے عہد کے سیاسی منظرنامے کو بے حد عمدگی سے واضح کرتے ہیں۔ جب ہیر رانجھے سے بچھڑ گئی تھی تو اپنے رانجھن کو پانے کی تڑپ اور بیقراری کو بیان کرتے ہوئے اس خواہش کا اظہار کرتی ہے ''میں ہُن جھوک رانجھن دی جانانال میرے کوئی چلے''۔ تبسم کاشمیری اس رُومانوی داستان کو اپنے ہم وطنوں کے لیے خوشحالی اور آزادی کی تلاش کے لیے علامتی طور پر استعمال کرتے ہیں:

شِکر دوپہر ہے
شہر کے اُوپر
رستے سارے بلدے
پاؤں میں چھالے، دِل میں چھالے
اک اک کل میں چھالے
دیکھتی جاؤں جھوک رانجھن کی
جھوک نظر نہ آوے
شالا ہوون اس دیاں خیراں
خوش وطناں وِچ وسّے
شالا تخت لہور دیاں خیراں

تخت پُھلّاں وچ وسّے (۲۱)

تبسم کاشمیری نے جبر اور خوف کو اپنی شاعری کا بنیادی تجربہ بنا کر ایک عہد کی زندگی کی تمام آوازوں کو ایک طویل نظم میں سمونے کی کامیاب کوشش کی ہے۔"نوحے تخت لاہور کے" میں فوک لاہور سے لے کر جدید مشینی عہد کے تموجات کا بیان بھی ملتا ہے۔یہ نوحے شہر کے پس منظر سے جنم لے کر جو منظر نامہ مرتب کرتے ہیں وہ ایک بے سہارا معاشرے کی زندگی کا نشیب و فراز ہے، جس کے شب و روز اُمید اور رجائیت سے تہی ہیں۔یہ نوحے بظاہر ایک شہر سے مخصوص ہیں مگر یہ بتدریج تیسری دُنیا کے تمام شہروں کے مقدر کی آواز بنتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ تبسم کاشمیری نے اس طویل نظم میں اپنے نوحوں کا بیان شہر کی علامت کے ذریعے کیا ہے جو ایک جسم میں تبدیل ہو جاتا ہے اور ہر طرح کی تکالیف برداشت کرتا ہے۔یہ جسم دراصل شاعر کا شعور ہے جس کے ذریعے وہ اپنی صورت حال کا ادراک کرتا ہے۔یوں شہر کی علامت کی یہ تدریجی تعلیب نظم کے معنی میں کئی سطحیں پیدا کرتی ہے۔

تبسم کاشمیری کے مجموعہ کلام "**کاسنی دھوپ**" میں بارش میں شامل نظمیں اُن کے "اوساکا" (جاپان) میں قیام کی یادگار ہیں جو کہ اُردو نثری نظم کے ایک نئے ذائقے سے روشناس کراتی ہیں۔یوں محسوس ہوتا ہے کہ شاعر کو جاپان کے فطری اور رومانوی ماحول میں فطرت کی رنگینوں کا مشاہدہ کرنے کا جو موقع میسر آیا اُسے اُنھوں نے اپنی نظموں میں سمو دیا ہے۔اس سے اُن کے اندازِ نظر میں مزید وُسعت پیدا ہوئی۔جذبے اور محسوسات کی ایسی صورتیں وجود میں آئیں جو شاعر کو ایک وسیع دُنیا میں خواب، حقیقت اور آدرشوں کے ساتھ ایک مسلسل سفر میں مصروف دکھاتی ہیں۔یہ رنگوں، خوشبوؤں اور حُسن کے دل فریب نظاروں کے بیچ تلاش اور امکانات کا ایک نامُختتم تخلیقی سفر ہے جس کے بہاؤ میں شاعر ایک گونہ سکون اور جمالیاتی مسرت محسوس کرتا ہے۔اس مجموعے کی زیادہ تر نظمیں فرحت کے احساس سے لبریز اور سرخوشی اور تسکین سے بھرپور ہیں۔اس مجموعے میں تبسم کاشمیری کی شاعری کا انداز زمانے کی چیرہ دستیوں پر احتجاج کی آواز بلند کرنے کے بجائے انسان دوست اور فطرت پسند شاعر کا معلوم ہوتا ہے۔اس حوالے سے ڈاکٹر افضال بٹ اور ڈاکٹر طاہر عباس طیب اپنے مضمون " تبسم کاشمیری بطور فطرت پسند شاعر !ایک جائزہ" میں لکھتے ہیں:

> "تبسم کاشمیری نے اپنے موضوعات، لب و لہجہ اور طرزِ فکر کے لحاظ سے اپنے پیش روشعرا سے مختلف رنگ اختیار کرتے ہوئے شعورِ ذات سے شعور کائنات تک کا اظہار منفرد پیرائے میں کیا ہے۔انھوں نے اپنے ارد گرد بکھرے ہوئے حسین رنگوں کے امتزاج سے کائنات کے حسن کو اپنے قلم میں سمیٹ کر شاعری کا حصہ بنا دیا ہے۔ان کے ہاں فطرت کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔وہ فطرت کی گود میں چھپ کر تمام مسائل کو یکسر

فراموش کر دیتے ہیں اور یہ ان کی نظموں کی کامیابی ہے کہ قاری بھی
فطرت کے ان نظاروں سے لطف اندوز ہوتا ہے اور اُن کے ساتھ سفر کرتا
ہے۔ زمین پر ان کا سفر نا مختتم اور نامعلوم منزلوں کی جانب ہے لیکن وہ
رنگوں، خوابوں، جگنوؤں اور ستاروں سے بھری دنیا ڈھونڈ لیتے ہیں۔"(۲۲)

ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے اپنے جملہ محسوسات کے اظہار کے لیے نثری نظم اور آزاد نظم کی ہیئت کو منتخب کیا ہے۔ وہ اپنی نظموں میں بہت سی ان کہی یا نا قابلِ بیان باتیں بھی خوب صورت الفاظ کے ذریعے کہہ جانے کی قدرت رکھتے ہیں۔ شکست وریخت کہیں لاہور شہر کی ہو یا جاپان کے مشہور صنعتی شہر ہیروشیما کی ہو، اُن کا دل اس پر اذیت محسوس کرتا ہے۔ انسان کی بے توقیری اُنھیں نا قابلِ برداشت معلوم ہوتی ہے لہٰذا وہ انسان کی عظمت کے گیت گاتے دکھائی دیتے ہیں۔ اپنی شاعری کی طویل مسافت کے دوران تبسم کاشمیری نت نئے اجنبی، نامعلوم اور انجان راستوں کے سفر پر روانہ ہوئے اور نت نئی دنیائیں تخلیق کرتے نظر آتے ہیں۔ طبقاتی بے انصافی ہو یا معاشرتی زندگی کے تضادات، اُن کے احتجاج کی صدا بھی اُن کی شاعری کے سفر میں شامل رہی ہے۔ اس طویل سفر کی مُسافت میں وہ محض الفاظ کا ہتھیار لے کر روانہ ہوتے ہیں:

میرے پاس شمشیر تھی نہ بیلچہ نہ کلہاڑا
میرے پاس بارود تھا نہ بندوقیں
میرے پاس وردی تھی نہ بُوٹ
میں صرف لفظوں کی کشتی لے کر
پانیوں میں اُتر گیا تھا
اور حرفوں کا آسمان اُٹھا کے
گلیوں میں نکل پڑا تھا(۲۳)

تبسم کاشمیری کی شاعری میں چاند، ستارے، ہوا، بارش اور رنگ باتیں کرتے محسوس ہوتے ہیں اور فطرت اپنی تمام تر دلکشی اور رعنائی کے ساتھ جلوہ گر دکھائی دیتی ہے۔ فطرت نگاری کا یہی رنگ اور اسلوب ایک تسلسل کے ساتھ تبسم کاشمیری کے مجموعہ کلام بازگشتوں کے پُل پر میں بھی دکھائی دیتا ہے۔ اس مجموعے کا نام بھی ایک خاص معنویت کا حامل ہے کہ اس مجموعے میں شامل نظموں میں بازگشتوں کے پُل پر مختلف آوازیں اور محسوسات ایک طویل بازگشت کی تعمیر کرتے دکھائی دیتے ہیں:

بہت مشکل ہے اکیلے اکیلے بازگشتوں کے پُل پر چلنا

دھوپ سے پانی نکالنا،
ریت میں مدفون ایک شہر ڈھونڈنا
یا برسوں تک اکیلے اکیلے شراب پینا!
میں تھک گیا ہوں ایک بچھڑے ہوئے ستارے کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے
اپنے لیے ایک کشتی بناتے
اور اپنے اندر سفر کرتے کرتے (۲۴)

اس مجموعے میں شامل ایک نظم "بازگشتوں کے پُل پر!" کا آخری حصّہ ملاحظہ کیجیے:

میرے ہاتھ میں امن کے پھول ہیں
میں فاختہ کے بچوں کو یہ پھول تحفے میں دوں گا
میں نے بازگشتوں کا اک پُل بنالیا ہے

پھر کہتے ہیں:

دیکھو میرا انتظار کرنا!
میں بارش سے
خوشبو کی چھاگل لاؤں گا
پہاڑ سے پھولوں کا خیمہ
اور میدان سے
سوسن کی ایک جھیل
بس ذرا شام گزرنے دو
میں بازگشتوں کے پُل پر
تمھیں رات بھر پیار کروں گا! (۲۵)

تبسم کاشمیری کی شاعری میں بازگشتوں کا لفظ یاد کے استعارے کے طور پر آیا ہے اور پُل رابطے کی علامت ہے چناں چہ تبسم کاشمیری کی شاعری ایک طرف تو اُن کے تخلیقی سفر میں اپنی ذات کی جانب مراجعت کا عمل ہے اور دوسری جانب ماضی سے اُن کی غیر منقطع سلسلہ استواریت کا پتا دیتی ہے۔ ماضی سے استواریت کے ساتھ ساتھ مستقبل کی بشارتوں کے امکانات بھی اس میں موجود ہیں۔ اس مجموعے کی نظموں میں ایک طویل نظم "میپلز، پشکلاوتی، موئن جوڈیرو" نہایت خوب صورت نظم ہے جس میں تبسم کاشمیری کا فن اپنی انتہا کو چھوتا ہوا محسوس ہوتا ہے اور فطرت نگاری اپنے عروج پر

دکھائی دیتی ہے۔ یوں بازگشت کی معنویت بھی مکمل طور پر آشکار ہوتی ہے:

وہ خزاں کی ایک دوپہر تھی
ہم لوٹ رہے تھے
میپل کے سرخ پتے دیکھ کر
خلقت کا ہجوم
چہرے ہی چہرے
چہرے، جو پتوں بھرے راستوں پر
لمحہ لمحہ اُگ رہے تھے
اور چہروں کے اوپر میپلوں کے سرخ سائے
پلوں کے نیچے بہتا ہوا دریا
اور دریا کے دونوں طرف
اونچے نیچے پہاڑ
نیچے پہاڑوں کے اس طرف بیلوں والے پرانے چوبی گھر
اور ان اونچے پہاڑوں پر
دریا میں گرتے ہوئے پتوں کے سرخ سائے
اور سایوں کی آوازیں
دھیمی،
مدھم،
پانی کی لہروں میں گھلتی،
ڈوبتی ہوئی،
بے آواز آوازیں
خزاں کی چمکتی ہوئی دوپہر
ہاں وہ پیلی دوپہر
وہ پتوں کے سرخ سائے
دریا میں تیرتے نیلے بجرے

محبت کرنے والے جوڑے

یاد ہیں کیا؟(۲۶)

یہ اس طویل نظم کا ابتدائی حصّہ ہے جس میں صدیوں کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ لکڑی کے قدیم مکانوں والی گلیوں میں ان گنت چوبی سیڑھیاں طے کر کے بُدھ کے مندر کا صدیوں پرانا منظر جاگتا دکھائی دیتا ہے اور نِروان کے حصول کی خاطر آنے والوں کی سات صدیوں سے آتی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ اس کے بعد سات صدیوں کی بھیگتی آنکھیں اور سُوکھتی زبانیں دکھائی دیتی ہیں۔ ہواؤں میں فاختاؤں کی کُوک، ندی کا چوبی پُل، دریا کے پانیوں کا شور، درختوں کے پتوں کی سائیں سائیں اور شہر کی روشنیوں کا سمندر سب کچھ نیچے رہ جاتا ہے اور پھر پندرہ صدیاں قبل پشکلاوتی کے ایک پہاڑی مندر میں سدھارتھ کے پھول بننے کا خواب، ایک طویل کہانی جس کا ایک ایک انگ نظم میں بولتا اور ایک پوری تہذیب کا سینہ کھول کر سامنے رکھتا دکھائی دیتا ہے۔ پانچ ہزار سال قبل کی بازگشت سنائی دیتی ہے اور موہنجوداڑو سفید پھولوں کی سرزمین کا منظر نامہ دھیرے دھیرے اُبھرتا ہے۔ یہاں نظم کا اختتام ہوتا ہے جہاں شاعر کہتے ہیں کہ یہ سفر ان حد زماں سے زماں تک کا سفر ہے، یہ شب و روز کا بہاؤ ہے اور ہم کاغذ کی کشتیوں کی مانند پل دو پل اس میں بہتے ہیں۔ ہمارے بادبانوں میں بھری آوازیں ہمیں چپ چاپ ان دیکھی سمتوں کی جانب لیے جاتی ہیں۔

تبسم کاشمیری اس طویل نظم میں پانچ ہزار پردوں کے پیچھے بہت پیچھے سب کچھ چھوڑ دینے کے بعد اب محض دُھندلائے ہوئے خواب اور تشنگی کی بابت کہتے ہیں کہ زمین پر اب شبِ غضب کی سیاہ چادر تن چکی ہے، اب لوگ خواب بھی نہیں دیکھ سکتے، ہمارے جسموں میں آنکھ کی پتلیوں سے پاؤں تک سیاہ اندھیرے چھا گئے ہیں اور ہمارے جسم عذاب سے جھک چکے ہیں۔ ہماری دعائیں ہتھیلیوں سے پھسل کر اندھیروں میں گم ہو گئی ہیں اب شاخوں پر پھول نہیں کہ موسموں کا سفر رُک گیا ہے۔ سورج سے اندھیرا ٹپکتا ہے گلیوں کی آنکھیں پتھرا گئی ہیں اور شہروں کے شکم خشک ہو گئے ہیں:

ہم سنتے ہیں روز و شب
اونچی اونچی ٹاپیں
ہم لٹک رہے ہیں وقت کی صلیب پر
ہم چیختے رہتے ہیں
چیختے رہتے ہیں
اب اتارو ہماری لاش!
اب اتارو ہماری لاش!!
ڈوب جاتی ہے یہ آواز

اندھیرے کے منجمد صحرا میں (۲۷)

اکن کی اپنے امیجز، اسلوبیات اور ڈکشن (لفظیات) کے اعتبار سے شاندار نظم ہے۔ یہ نظم گہری معنویت اور بھرپور تاثر کی حامل ہے جس میں شاعر نے ایک پوری تہذیب کی تاریخ کو سمو کر بیان کر دیا ہے۔ اس طویل نظم کا موضوع ان کے جاپان قیام کی دین ہے جہاں اُنھوں نے بُدھ ازم کا نہایت گہرائی سے مُطالعہ کیا اور بعد ازاں نہایت مہارت سے اسے نظم کے قالب میں ڈھال لیا۔ ڈاکٹر عاصمہ اصغر اپنے مضمون "ڈاکٹر تبسم کاشمیری کا شعری سفر (تمثال سے سرخ خزاں کی نظموں تک)" میں لکھتی ہیں:

"جاپان بہت سے لوگ گئے ہوں گے مگر تبسم کاشمیری نے جس طرح جاپان اور اس کی تہذیب و ثقافت کو اپنے باطن کے آئینے میں اُتارا ہے، کسی دوسرے سے ممکن نہیں ہو سکا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے اس سورج دھرتی کو ایک منجھے ہوئے تخلیق کار کی آنکھ سے دیکھا اور اس کے خوش رنگ مناظر کو اپنے قلب میں جذب کیا ہے۔" (۲۸)

تبسم کاشمیری کی شاعری میں علامتیت، استعاریت، فطرت سے محبت، گہرے جمالیاتی شعور کے ساتھ انسان دوستی اور عدل و مساوات پر مبنی معاشرے کی تشکیل کی شدید خواہش بھی ملتی ہے۔ ان کی نظمیں معاشرے کے رِستے ہوئے ناسُوروں، بے ہئیت زندگی اور بے سمت سفر کی رُوداد سناتی ہیں کہ چار سُو شبِ غضب کے گھور اندھیروں کا راج ہے۔ کئی نسلوں کو اس شبِ غضب نے اپنی تاریکیوں کی لپیٹ میں لے رکھا ہے، ایک مُدت سے نہ تو سورج نکلتا ہے اور نہ ہی اپنے دن بدلنے کا نام لیتے ہیں۔ "بازگشتوں کے پل پر" شعری مجموعہ میں شامل "نظم" میں اُن کا کہنا ہے کہ کوئی بھی اُن پہیلیوں کو بُوجھ نہیں سکتا جو میں نے پنچھیوں سے سیکھی ہیں اور کوئی اُس ملبوس کو پہن نہیں سکتا جو میں نے فاختاؤں کی مملکت میں پہنا ہے:

مجھے نفرت ہے، جھوٹ سے
جنگ سے اور ظلم سے
مجھے نفرت ہے جبر سے، قید سے اور چوب سے
میں جھوٹ کو کاٹ دینا
ظلم کو چیر دینا
جبر کو پھاڑ دینا
اور چوب کو جلا دینا چاہتا ہوں!
میں روتا ہوں فاختاؤں کے قتل پر

بادلوں کی موت پر،
اور پیڑوں کی ہچکیوں پر
رات لمبی ہوتی جاتی ہے

پھر مزید کہتے ہیں:

میں ایک دوست ستارے سے
بستیوں کے لیے روشنی
انسانوں کے لیے امن
اور زمین کے لیے خوشبو مانگتا ہوں!(۲۹)

تبسم کاشمیری کے چھٹے اور آخری مجموعہ کلام ''سرخ خزاں کی نظمیں''(مشمولہ ،کلیات ؛ پرندے، پھول، تالاب) میں یاسیت اور اُداسی کا رنگ غالب ہے۔ خوابوں کی ٹوٹ پھوٹ ،زندگی کی لاحاصلی کا نوحہ ،منافقتوں کا شکوہ اور نسلی تعصب کے خلاف جہاد میں شمولیت ان نظموں کے موضوعات ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ رنگوں، بہاروں اور خوشبوؤں کی دلفریب وادیوں سے گزرتے ہوئے ایک لق ودق صحرا میں آنکلے ہوں جہاں گرم لُو کے تھپیڑے انسانی جسم اور احساس کو جُھلسائے دے رہے ہوں۔ اُن کی نظم ''جہاں گُلابوں کے سر قلم کیے جاتے ہیں'' میں تپتی دوپہروں میں گندھک کی مانند جلتے اور فاسفورس کی طرح بھڑکتے لوگوں کا ذکر ملتا ہے۔ ایک ایسی جگہ دکھائی گئی ہے جہاں شاہراہوں کے چہرے خون سے لت پت ہوتے ہیں۔ شاعر خود کو ایک ایسی جگہ کا باسی بتلاتے ہیں جہاں ہوا سیاہ نقاب پہن کر ہاتھ میں ننگی تلوار تھامے نمودار ہوتی ہے۔ وہاں بلدیہ کا دفتر انسانوں کو کُوڑے کا ڈھیر سمجھ کر شہر سے باہر پھینک دیتا ہے اور کوئی انتظامی افسر اُنھیں ایک تباہ کُن سیاسی جرثومہ جان کر ایک ہولناک ویکسین لگا دیتا ہے۔ اس شہر میں قتل کے تہواروں میں گُلابوں کے سر قلم کیے جاتے ہیں، بادلوں کو ذبح کیا جاتا ہے، ستاروں کی آنکھیں مکحول کر دی جاتی ہیں اور چاند کے چہرے پر تیزاب گرا دیا جاتا ہے۔ اس نظم کا ایک حصّہ مُلاحظہ کیجیے:

جہاں ذہنوں کی لوح پر
اندھیر کے اعراب لگا دیے جاتے ہیں
روشنی کی رگیں کاٹ دی جاتی ہیں
اور فکر کو مقروض کر دیا جاتا ہے
جہاں حواسِ خمسہ کے اُوپر
سیاہ ٹوپیوں والے ریچھ

مچانوں میں پہرہ دیتے ہیں
ایک ایسی جگہ، جہاں زرہ بکتروں سے
دم دار ستارے نکلتے ہیں
اور زندہ انسانی تابوتوں میں
پیوست ہو جاتے ہیں
ہم رہتے ہیں اسی جگہ
اسی آسمان کے نیچے
مقتول بادلوں کے آس پاس
کسی جلاد کی آواز کے نزدیک
ایک دم دار ستارے کے سائے میں
جہاں گلابوں کے سر قلم کیے جاتے ہیں
اور جہاں بارش کو سُولی پر لٹکا دیا جاتا ہے (۳۰)

اس مجموعے کی نظموں میں تبسم کاشمیری نسلی تعصّب کے خلاف جنگ میں شریک نظر آتے ہیں۔ نظموں "افریقا افریقا"، "آج مرا دل افریقا ہے"، "افریقا میں موت" اور "مولا ئسس کے خون کی صبح" میں تبسم کاشمیری امریکی شاعر مولا ئسس سے اظہارِ یکجہتی کرتے نظر آتے ہیں جسے نسل پرستوں نے زیر کر دیا تھا۔ وہ مولا ئسس کی موت کو رائیگاں تصور نہیں کرتے بلکہ اُس کی آنکھیں افریقا میں آزادی کا نیا سورج طلوع ہوتے دیکھتی ہیں:

مولا ئسس کی آنکھیں باہر ابل چکی ہیں
لیکن مولا ئسس کی آنکھیں جاگ رہی ہیں
جاگ رہی ہیں
افریقہ پہ حُریّت کے سورج کو وہ دیکھ رہی ہیں
افریقہ میں ایک نئے سورج کی صبح کو دیکھ رہی ہیں (۳۱)

فیض کی طرح تبسم کاشمیری بھی عالمی سطح پر امن اور انسان دشمن جنگ و جدل کے خلاف اور مظلوموں اور زیر دستوں کے حق میں ہیں۔ وہ مظلوموں کو مزید ظلم و ستم سہتے رہنے کے بجائے ظلم و بربریت کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے اور ناانصافی کا خاتمہ کرنے کے لیے ہمت و جرأت سے کام لینے کی تلقین کرتے ہیں۔ کیوں کہ تبسم کاشمیری کے نزدیک آزادی ہر ایک کا بنیادی و پیدائشی حق ہے:

آج الوداع کہہ دو تاریک سورج کو، بے نور ستاروں کو
جسموں کے زنگ کو، اور چکنا چور ہو جانے کے لایعنی ڈر کو
آج کچل دو مکروہ انسانی جرائم کرنے والے درندوں کو
ان کے زنداں کو، زنداں کے ہر طاقچے کو
اور سامراجی گھوڑوں کی ٹاپوں کو
آجاؤ افریقہ
آجاؤ افریقہ (۳۲)

اسی طرح تبسم کاشمیری نے اپنی نظم "نو مور ہیروشیما" اور "فاختہ فاختہ" میں تمثیلی رنگ میں کُل عالم میں امن و آشتی کے نئے دور کے آغاز کی خواہش کا اظہار کیا ہے۔ نظم "نو مور ہیروشیما" میں تبسم کاشمیری نے جاپان کے مشہور صنعتی شہر ہیروشیما کی روشن دُھوپ، سبز دن، آسمان پر اُڑتے پرندوں، تتلیوں کا تعاقب کرتے بچوں اور چوبی چھتوں پر لُڑھکتے بادلوں کے مناظر کا ذکر کرتے ہوئے ہیروشیما کے آسمانوں پر ہونے والے دھماکے کی تصویر کشی انتہائی دردناک انداز میں کی ہے:

ہیروشیما کے آسمانوں پر آج پُھول نہیں، پرندے نہیں
آج کے دن آسمانوں پر
اُڑ رہی ہیں جلی ہوئی بدہئیت، بے چہرہ رُوحیں
یہ بے چہرہ بیکل رُوحیں
آج چیخ رہی ہیں، چیخ رہی ہیں
سنو! سفید، پیلی، بُھوری اور کالی چمڑی والے انسانو سُنو!
ذرا غور سے سُنو!
آج ہیروشیما کے آسمانوں پر رُوحیں چیخ رہی ہیں
"نو مور ہیروشیما"
"نو ہیروشیما"
"نو مور ہیروشیما" (۳۳)

تبسم کاشمیری نے نئی اُردو شاعری کے فروغ اور ترویج کے لیے اپنی خدمات انجام دیں اور جدید اُردو نظم کے دامن میں مختلف شعری تخلیقی تجربات کے ذریعے اضافے کیے۔ اس ضمن میں اُن کے تازہ ترین شعری تجربے کا ذکر کیے

بغیر اُن کی شاعری کے تنقیدی جائزے کو تمام نہیں کیا جا سکتا۔ انھوں نے جدید پنجابی نظموں کا ایک مجموعہ بھی اُردو ادب کو عطا کیا، جو تا حال زیر اشاعت ہے۔ پنجابی زبان میں جدید تجرباتی نظموں کے مجموعے کا عنوان ''مکتی کی تلاش'' رکھا گیا ہے، جو کہ پنجابی زبان میں اسلوبیاتی، معنوی و فکری اور ہئیتی اعتبار سے بڑی اہمیت کا حامل ثابت ہو گا۔ انتہائی مختصر سے اس شعری مجموعے میں بھی تبسم کاشمیری نے اپنے شعری سفر کے آغاز سے لے کر اب تک اپنے مقصدِ حیات کو ترک نہیں کیا ۔ آج بھی سیاسی و سماجی جبر، خوف، طبقاتی تفریق، انسانیت دشمن ظالمانہ قوانین، جاگیر دارانہ و سرمایہ دارانہ نظام، گھٹن کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنا اپنا اولین فرض خیال کرتے ہیں۔ زیر اشاعت اس پنجابی جدید نظموں کے مجموعہ کا عنوان'' مکتی کی تلاش'' واضح کر دیتا ہے کہ اُن کے اب تک کے اُردو شعری مجموعہ جات میں جس طرح شہر اور جسم علامت بن جاتے رہے ہیں، اس مجموعہ میں بھی سیاسی و سماجی نظام میں جکڑے ہوئے جسم آزادی کی راہیں تلاش کر کے اپنی نجات چاہتے ہیں۔ آزادی اور مکتی کی یہ تلاش مختلف صورتوں میں متشکل ہوتی نظر آتی ہے۔ کبھی یہ کھوج محبوب کی کھوج بن جاتی ہے، کبھی اپنی ذات، اپنے وجود کی موجودگی پر سوال اُٹھاتی ہے تو کبھی اپنے ماضی سے منسلک خوبصورت یادوں کی تلاش میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

اس شعری مجموعے کی نظموں میں پنجابی شاعری کی عظیم کلاسیکی روایت کا تسلسل ملتا ہے اور ان نظموں کا مجموعی مزاج بھی اُسی درویشانہ لے سے ہم آہنگ ہے جو ہمارے کلاسیکی صوفی شعرا کا خاص وصف ہے۔ رشید امجد نے اس شعری مجموعے کے پیش لفظ میں پنجابی کلاسیکی شاعری کو بنیادی طور پر وجودیت کی شاعری قرار دیتے ہوئے تبسم کاشمیری کی اس مجموعے میں شامل نظموں کو بھی اس وصف اور روایت سے جوڑا ہے۔ رشید امجد کا یہ مضمون تبسم کاشمیری کی پنجابی نظموں کی تفہیم کے حوالے سے بے حد مفید ثابت ہو گا۔ ان نظموں کے حوالے سے وہ تحریر کرتے ہیں:

> ''بنیادی طور پر ان کا ظاہری رنگ وجودی ہے لیکن باطن میں عصری سیاسی سماجی شعور بھی پوری طرح موجود ہے۔ یہ نظمیں عشق کی اس روایت کا تسلسل ہیں جو پوری زندگی کا احاطہ کرتا ہے اس میں اگر ایک طرف روحانی کشف کی لذت ہے تو دوسری طرف بڑے ملائم انداز میں اپنے عہد کا شکوہ بھی ہے۔ تبسم کاشمیری نے عشق کی اس عظیم روایت کو از سر نو اپنے عہد سے جوڑا ہے۔''(۳۴)

تبسم کاشمیری کی پنجابی نظمیں کرداری نظمیں ہیں۔ تقریباً ہر نظم میں ایک ظاہری اور ایک مستور یعنی ایک پوشیدہ کردار صاف جھلکتا ہے۔ ظاہری کردار شاعر کی اپنی ذات ہے اور مستور کردار ایک نامعلوم نسوانی کردار۔ ان نظموں میں ایک پوشیدہ کردار زمانے کا بھی ہے، جس میں تاریخ، تہذیب اور وقت تینوں شامل ہیں۔ ایک نامعلوم نسوانی کردار جو

اس شعری مجموعے کی ہر نظم میں دکھائی دیتا ہے دراصل شاعر کی باطنی شخصیت ہے۔ یہ وجودی کردار ہر نظم میں ایک نئی کہانی بناتا ہے جسے شاعر خود بیان کرتے ہیں۔ اس حوالے سے تبسم کاشمیری کی ہر نظم ایک خود کلامی ہے جو مکالمے میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اپنے آپ میں کھو جانے اور پھر اس کا احساس ہو جانے کے بعد خود اپنی ہی ذات کی تلاش کا سفر اس شعری مجموعے کی نظموں میں بیک وقت وجودیت اور خارجیت کا امتزاج پیدا کرتا ہے اور انھیں انفرادیت عطا کرتا ہے:

او میرے وجود تے لاوجود دا گم ہونا سی؟
یا کجھ ہور سی؟
یا اوھدے ہون یا نہ ہون دی کوئی گل سی
میں حالی تائیں وی سمجھ ہی نہیں سکیا
میں کس منزل توں لنگھیاں ساں
تھوڑا جیہا، ہاں بہت تھوڑا جیہا ویلا سی
جس ویلے چ مینوں لگدا سی
میں نئیں آں
اگر میں نئیں ساں تے فیر میں کتھے ساں؟ اوہ کیہہ سی؟(۳۵)

اس مجموعے کی ہر نظم ایک چھوٹی سی کہانی معلوم ہوتی ہے جو اپنے آغاز، وسط اور اختتام کے مراحل طے کرتی نظر آتی ہے۔ ہر نظم اپنا معنوی دائرہ مکمل کرتی ہے اور قاری کے وجود میں تادیر احساس اور سرشاری کے ساتھ اُترتی جاتی ہے۔ تبسم کاشمیری کی نظموں کا بنیادی موضوع بیک وقت ملامتی اور مزاحمتی ہے۔ مثال کے طور پر اُن کی نظم "ایک مکالمہ شاہ حُسین نال" میں وہ بیک وقت ملامتی اور مزاحمتی دکھائی دیتے ہیں۔ وہ ایک طرف تو شاہ حُسین کی مانند خود کو بھی ملامتی کہتے ہیں اور دوسری جانب مزاحمتی انداز اپناتے بھی نظر آتے ہیں:

شاہ حُسین اُٹھ! قبروں اُٹھ!!
مادھونوں اٹھا!!!
"ہن تے سیاں کھیڈن آئیاں"
ویکھ کل دیوے تیرے اندر اندر بلدے سن
تے اج تیرے چار چوفیرے
تیرے ناں دے دیوے بل رہے نیں
شاہ حُسین اُٹھ! قبروں!!

مادھونوں وی اُٹھا!!!

تیرا ملامتی بیلی

کیسری چولہ پا کے تے پیراں چ گھنگھرو سجا کے

تینوں ملن آیا اے! (۳۶)

رشید امجد اس نظم کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"ایک مکالمہ شاہ حُسین نال" میں شاعر اعتراف کر رہا ہے کہ وہ شاہ حُسین کی طرح ملامتی ہے لیکن پوری نظم میں مزاحمت کا رویہ بھی موجود ہے۔ یہ مزاحمت دورِ اکبری میں چاہے دُلا بھٹی کی سزا کے خلاف ہو یا عہدِ حاضر میں بے انصافیوں کے خلاف شاعر اپنی آواز ان عظیم صوفی شعرا سے ملا رہا ہے جو اپنے اپنے دور میں مزاحمت سے اپنے عہد کی تاریخ لکھ رہے تھے۔ شاہ حُسین ہوں یا بلھے شاہ، وارث شاہ ہوں یا میاں محمد سب کا بنیادی تنازع روح اور جسم کے آزاروں کا روحانی علاج تھا۔ تبسم کاشمیری کی نظموں کی بنیادی کُنجی بھی یہی ہے۔" (۳۷)

تبسم کاشمیری کی نظموں کے دونوں کردار یعنی واحد متکلم اور واحد غائب یعنی نسوانی کردار بھی جسم اور روح کے ازلی تنازع کے متوازی کردار ہیں۔ یہ دونوں کردار ایک دوسرے کو کھوجتے ہوئے کبھی پا لیتے ہیں اور کبھی گُم کر دیتے ہیں۔ خود اپنی ذات کی تلاش کا یہ سفر ازلی ہے اور شاید ابد تک یونہی جاری و ساری رہے گا۔

تبسم کاشمیری کی یہ پنجابی نظمیں سوچ و فکر کی نئی راہیں دکھاتی ہیں اور ساتھ ہی ساتھ ایک رومانی لذت سے بھی آشنائی دلاتے ہوئے سرشار کرتی ہیں۔ وہ ماضی پرست شاعر ہیں لہٰذا اپنے ماضی کو بے حد یاد کرتے ہیں اور یاد کرتے کرتے اپنے آپ میں یوں کھو جاتے ہیں کہ پھر ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتے پھر اچانک کوئی علامت یا استعارہ اُنھیں واپس اپنے موجودہ عہد میں لے آتا ہے۔ یہ پرانی یادیں کبھی کانگڑی، کبھی باقرخانیوں اور کبھی کسی اور چیز کے ذریعے اُنھیں ماضی کے خلوص اور محبت سے جُڑی ہوئی روایات کی یاد دلاتی ہیں۔ اس ضمن میں عہدِ حاضر کی بے مروتی کا بھی اُنھیں شدت سے احساس ہے اور جب وہ اس کا اظہار کرتے ہیں تو لہجہ قدرے بے باک بھی ہو جاتا ہے۔ اُن کی کچھ نظموں میں نسوانی کردار آج کل کی بے مروتی کی علامت بنتا ہوا بھی محسوس ہوتا ہے۔ بنیادی طور پر تبسم کاشمیری کی یہ نظمیں اپنی ذات کی تلاش کے سفر کی کہانیاں ہیں۔ اُن کی ایک بہت خوب صورت نظم "الھڑ بلھڑ باوے دا" قدیم لوک گیت کو عہدِ حاضر کے شہری نظامِ زیست سے جُڑا ہوا دیکھا جا سکتا ہے:

الھڑ بلھڑ باوے دا

باوا جی سی جاوے گا
پڑھنا لکھنا سیکھے گا
فیر باؤ بن جائے گا
الھڑ بلھڑ باوے دا
باوا پیزا کھاوے گا
باوی نوں وی کھواوے گا
باوی ایک دن آوے گی
سارا گھر فیر سجے گا
باوی چپ چپ ہسے گی
باوے دے ول تکے گی
الھڑ بلھڑ باوے دا
باوا گروسری لیاوے گا
باوی کیک بنائے گی
باوے نوں اوہ کھواوے گی
آپ وی کھاندی جاوے گی
الھڑ بلھڑ باوے دا
باوا فجری اٹھے گا
چاء دی پیالی پیوے گا
دوڑ کے دفتر جاوے گا
مُٹھ نوٹاں دی لیاوے گا
تے باوی ہتھ پھڑاوے گا(۳۸)

تبسم کاشمیری نے اُردو نظم نگاری کے ساتھ ساتھ اب پنجابی زبان میں ان مختصر نظموں میں بھی اپنے باطن، ظاہر، گُم ہو جانے اور پھر بچھڑ کر مل جانے کا بے تکلف اظہار کیا ہے۔ اپنے اندر کی یہ اوڈیسی، ان چھوٹے چھوٹے تجربات اور محسوسات کے ساتھ مل کر ایک بڑے باطنی و خارجی سفر کی رُوداد بنتی ہے۔ پھر یہ ایک شاعرانہ کشفی وجد کے ذریعے قاری کو بھی اپنے ساتھ مستانہ وار رقص کے دائرے میں لے آتی ہیں، جو ہمارے عظیم پنجابی صوفی شعرا کی روایت

ہے۔ تبسم کاشمیری نے اس روایت کو زندہ رکھا ہے۔ اُنھوں نے اپنی کئی نظموں میں ان عظیم صوفی شعرا کے مصرعوں سے بھی استفادہ کیا ہے اُنھیں اس فنی مہارت کے ساتھ اپنے مصرعوں سے جوڑ دیا ہے کہ نہ صرف نظم کا معنوی حُسن بڑھ جاتا ہے بلکہ اس کی معنوی حدود بھی وُسعت اختیار کر جاتی ہیں۔ فنی اور فکری حوالوں سے تبسم کاشمیری کی پنجابی نظمیں ہم عصر پنجابی شاعری میں انفرادیت کی حامل ہیں اور نئی نسل کے شعرا کے لیے بھی ایک نیا در وا کرتی دکھائی دیتی ہیں۔

تبسم کاشمیری نئی شاعری یا لسانی تشکیلات کی تحریک کے نمائندہ اہم ترین شاعر ہیں۔ شفیق شخصیت، دھیما لب و لہجہ، گفتگو کے دوران کھو جانا، گہری سوچ میں ڈوب جانا اور ماضی کی یادوں کو اپنے دھیان کے آتشدان میں سجانے میں کوشاں ڈاکٹر تبسم کاشمیری گہری افسردگی کی لپیٹ میں مبتلا عصرِ جدید کا باشعور اور حساس ترین شاعر ثابت ہوتے ہیں۔ وہ ایک طرف تو ایک بچے کی طرح پُر تجسس انداز میں فطری خوب صورتی کو دیکھ کر حیرت زدہ بھی ہوتے ہیں اور محظوظ بھی ہوتے ہیں اور دوسری جانب رنگوں، روشنیوں اور بہاروں کے شیدائی ہونے کے ساتھ ساتھ دنیا میں پھیلے ظلم اور بربریت کے جبر پر افسردہ اور غمزدہ بھی دکھائی دیتے ہیں اور اس کے خلاف صدائے احتجاج بھی بلند کرتے ہیں۔ اُنھوں نے شاعری میں لسانی، اسلوبیاتی اور ہئیتی تجربات کیے ایک طرف لسانی تشکیلات کے بانی اور اپنے ہمدم افتخار جالب کی مانند نیا لسانی لہجہ مرتب کیا اور اپنے محسوسات کے اظہار کی خاطر نئی لفظیات کو منتخب کیا اور ساتھ ہی ہئیتی اعتبار سے اُردو نظم نگاری کے میدان میں اپنی طویل نظموں ''نوحے تخت لاہور کے'' اور ''میلیز، پشکلاوتی، موئن جوڈیرو'' جیسی نظموں کا اضافہ کیا۔ وہ عصرِ حاضر کے جدید شاعر ہیں جن کا تہذیبی شعور، کلاسیکی انداز، اپنے عصری حالات سے آگاہی اور ذوقِ جمالیات اُن کے تخلیقی سفر کو دیگر شعرا سے ممتاز و منفرد بنا دیتا ہے۔ اُن کی شاعری کے فہم تک رسائی پانے کے لیے ایک خاص جذبہ و اندازِ نظر کی ضرورت ہے کہ وہ رنگوں سے مل جُل کر زندگی کرنے کا فن سیکھتے ہیں لفظوں سے باتیں کرتے اور حرفوں کے اندر سوتے اور صدیوں تک سوچتے ہی چلے جانے اور صدیوں تک مشاہدے کا ہُنر درختوں سے سیکھتے ہیں۔ وہ بادلوں جیسی ٹھنڈک دینے، بارشوں جیسے گیت سنانے اور سوسن جیسے پھول بنانے پر یقین رکھتے ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ انیس ناگی، تبسّم کاشمیری، نیا شعری اُفق، لاہور: جمالیات، دوسری اشاعت ۱۹۸۸ء، ص:۱۴۵

۲۔ تبسّم کاشمیری، **تمثال**، لاہور: قوسین، بارِ اوّل، ۱۹۷۵ء، ص:۴۰

۳۔ تبسّم کاشمیری، نظم، ''ندامت ہی ندامت''؛ **پرندے، پھول، تالاب**، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۶ء، ص:۴۰۔۳۹

۴۔ تبسم کاشمیری، تمثال، ص:۹۴

۵۔ ایضاً، ص:۴۳۔۴۲

۶۔ صدف بخاری، ڈاکٹر، ڈاکٹر تبسم کاشمیری کی منتخب نظمیں: ایک تنقیدی جائزہ، مشمولہ؛ **بازیافت**، جلد نمبر ۲، شمارہ ۲۶، لاہور: شعبہ اردو اورینٹل کالج، پنجاب یونیورسٹی، ۲۶ جنوری تا جون ۲۰۱۵ء، ص:۳۹۹

۷۔ تبسم کاشمیری، تمثال، ص:۱۰۰ تا ۱۰۳

۸۔ ایضاً، ص:۹۲۔۹۱

۹۔ ایضاً، ص:۴۷

۱۰۔ سرمد صہبائی، فلیپ؛ **تمثال**، از تبسم کاشمیری

۱۱۔ تبسم کاشمیری، تمثال؛ پرندے، پھول، تالاب، ص:۷۹

۱۲۔ ایضاً، ص:۳۸۔۳۷

۱۳۔ تبسم کاشمیری، زوال کی آخری چیخ، تمثال؛ پرندے، پھول، تالاب، ص:۸۱

۱۴۔ تبسم کاشمیری، نوحے تختِ لاہور کے؛ پرندے، پھول، تالاب، ص:۱۷۸۔۱۷۹

۱۵۔ ایضاً، ص:۱۸۵

۱۶۔ ایضاً، ص:۱۷۹

۱۷۔ ایضاً، ص:۲۰۳

۱۸۔ ایضاً، ص:۲۳۵

۱۹۔ ایضاً، ص:۲۴۵۔۲۴۶

۲۰۔ ایضاً، ص:۲۶۰۔۲۶۱

۲۱۔ ایضاً، ص:۲۸۹۔۲۹۰

۲۲۔ افضال بٹ، ڈاکٹر، طاہر عباس طیب، ڈاکٹر، تبسم کاشمیری بطور فطرت پسند شاعر! ایک جائزہ؛ الحمد، شمارہ ۲۱،

اسلام آباد: شعبہ اُردو الحمد اسلامک یونیورسٹی، جولائی تا دسمبر ۲۰۲۰ء، ص:۴۵

۲۳۔ تبسم کاشمیری، شاعری اُگاؤں گا؛ کاسنی بارش میں دُھوپ، لاہور: نگارشات پبلی کیشنز، ۱۹۹۰ء، ص:۱۷

۲۴۔ تبسم کاشمیری، بازگشتوں کے پُل پر، لاہور: دستاویز مطبوعات، ۱۹۹۵ء، ص:۱۴

۲۵۔ ایضاً، ص:۴۳-۴۲

۲۶۔ ایضاً، ص:۱۱۲-۱۱۱

۲۷۔ عاصمہ اصغر، ڈاکٹر، ڈاکٹر تبسم کاشمیری کا شعری سفر (تمثال سے سرخ خزاں کی نظموں تک)، مشمولہ؛ تحقیقی زاویے، بھمبر: شعبہ اُردو، الخیر یونیورسٹی بھمبر، شمارہ ۲۰۱۶، ۷ء، ص:۲۶۵

۲۸۔ تبسم کاشمیری، بازگشتوں کے پل پر، ص:۱۴۷-۱۴۶

۲۹۔ ایضاً، ص:۴۰-۳۹

۳۰۔ تبسم کاشمیری، سُرخ خزاں کی نظمیں؛ پرندے، پھول، تالاب، ص:۶۴۰-۶۴۱

۳۱۔ تبسم کاشمیری، مولائیسس کے خون کی صبح؛ پرندے، پھول، تالاب، ص:۵۳۳

۳۲۔ تبسم کاشمیری، سرخ خزاں کی نظمیں؛ پرندے، پھول، تالاب، ص:۶۰۷

۳۳۔ ایضاً، ص:۵۴۹-۵۴۸

۳۴۔ رشید امجد، پیش لفظ، مشمولہ؛ مکتی دی تلاش از تبسم کاشمیری، غیر مطبوعہ

۳۵۔ تبسم کاشمیری، مکتی دی تلاش، غیر مطبوعہ (مخزونہ تبسم کاشمیری)

۳۶۔ ایضاً، ص:۱۰۸

۳۷۔ رشید امجد، پیش لفظ، مکتی دی تلاش از تبسم کاشمیری، غیر مطبوعہ (مخزونہ تبسم کاشمیری)، ص:۱۱

۳۸۔ تبسم کاشمیری، مکتی دی تلاش، زیرِ اشاعت، (مخزونہ تبسم کاشمیری) ص:۱۰۳-۱۰۴